فکرِ مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر

از قلم: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

© rasailojaraid.

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کا مندرجہ ذیل مضمون بظاہر تو ایک خط ہے جو موصوف نے برادرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اس مضمون کی تحسین اور تائید کے لیے لکھا تھا جو جون ۱۹۶۷ء کے 'میثاق' میں "تذکرہ و تبصرہ" کے عنوان کے تحت شائع ہوا تھا لیکن اس نے یورپ کے فلسفہ و فکر کے تاریخی ارتقاء کے موضوع پر ایک جامع اور مبسوط مقالے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انتہائی اختصار اور کمال جامعیت کے امتزاج کے اعتبار سے یہ تحریر اپنی مثال آپ ہے۔ کاش کہ پروفیسر صاحب کی بعض دوسری ناگزیر مصروفیات نے موصوف کو مہلت دی ہوتی اور وہ اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھ سکتے تو فلسفۂ جدید کے طالب علموں کی رہنمائی کا ایک مستقل سامان ہو جاتا۔ بحالتِ موجودہ بھی کامل یقین ہے کہ یہ تحریر فلسفۂ جدید کے بہت سے طالب علموں کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوگی۔ پروفیسر صاحب کی یہ تحریریں اولاً "میثاق" کی دسمبر ۶۸ء اور جنوری ۶۹ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں جب وہ مقالہ "دارالاشاعت الاسلامیہ" کے تحت "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" کے عنوان سے شائع ہوا تو پروفیسر صاحب کی اس تحریر کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا

© rasailojaraid.

عبدالماجد دریاآبادی مرحوم و مغفور نے 'صدق جدید' کی اشاعت بابت، فروری [illegible]ء میں تحریر فرمایا تھا۔

"دونوں مقالے ماہنامہ 'میثاق' لاہور میں قسط وار نکل چکے ہیں۔ دونوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے، دونوں فکر انگیز ہیں۔ اور ایک طرف جوش و اخلاص اور دوسری طرف دانش و باریک بینی کے مظہر ہیں۔ مرض کی تشخیص اور تدبیر علاج دونوں میں دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے ـــــ رسالہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے"

بعد میں جب مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" کے دو ایڈیشن شائع ہوئے تو کچھ کفایت کے پیشِ نظر اور کچھ ـــــ اس بنا پر کہ اس میں راقم کے لئے بہت تحسین آمیز الفاظ استعمال ہوئے تھے پروفیسر صاحب کی یہ تحریر شاملِ اشاعت نہ کی گئی۔

خود راقم کو ان دونوں تحریروں سے ایک نہایت قریبی ذہنی اور قلبی لگاؤ رہا ہے۔ چنانچہ جب راقم فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی تکمیل کے لئے انگلستان گیا تو راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ وہاں پہلے ایک سال ہی کے دوران راقم نے برادرِ محترم کی اُس تحریر کو چھ بار پڑھا تھا ـــــ اور اب احساس ہوتا ہے کہ انگلستان کی فضا، بالخصوص یونیورسٹیوں میں الحاد و مادہ پرستی کا خصوصاً اس دَور میں جو شدید تسلّط تھا اس سے حفاظت میں جہاں اصل فضل تو اللہ کا ہے وہاں عالمِ واقعہ میں برادرِ محترم اور چشتی صاحب کی ان تحریروں کو بہت دخل حاصل ہے۔

پروفیسر چشتی صاحب کی یہ تحریر ۱۹۷۵ء میں 'میثاق' میں دوبارہ شائع ہوئی تھی اور اب تیسری بار 'حکمتِ قرآن' میں شائع کی جا رہی ہے۔ اس لئے کہ اُس وقت 'میثاق' کا حلقہ بہت محدود تھا ـــــ ان شاء اللہ، 'حکمتِ قرآن' کے نئے قارئین کے لئے یہ تحریر نہایت دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کا موجب ہوگی۔

خاکسار،

ڈاکٹر ابصار احمد

© rasailojaraid.

© rasailojaraid.

© rasailojaraid.

برادرم عزیزم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میثاق ماہ جون ۱۹۶۷ء میں جو خیالات آپ نے تحت "تذکرہ و تبصرہ" سپرد قلم کئے ہیں ان کو پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور آپ کے لیے تہ دل سے دُعا بھی نکلی۔ آپ نے عصرِ حاضر پر جو تبصرہ کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اہلِ مغرب کا ملحدانہ زاویۂ نگاہ، اس زاویۂ نگاہ کا اہلِ مشرق کے ذہنوں پر تسلّط، اس کے مضر نتائج، اس ناگوار صورتِ حال سے رہائی کی تجویز اور اصلاح حال کی راہ۔ ان مباحث پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ بلا شبہ آپ کی اصابتِ فکر و رائے، معاملہ فہمی، ژرف نگاہی اور حقائق رسی کا واضح ثبوت ہے۔ میں آپ کو صدق دل سے مبارکباد دیتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو جوانی میں بوڑھوں کی سی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی کسی خدمت کے لیے آپ کو منتخب کیا ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو خدمتِ دین کی بیش از بیش توفیق بھی عطا فرمائے۔

میں نے بھی نصف صدی تک (از ۱۹۱۷ء تا ایندم) انہی دو تین مسائل پر غور کیا ہے۔ یعنی مغرب میں الحاد اور مادّیت کے فروغ کے اسباب، ان مغربی افکار کا اقوامِ مشرق کے ذہنوں پر تسلّط اور اس تسلّط سے رہائی کی صورت۔ مجھے آپ کا مضمون پڑھ کر جو غیر معمولی مسرّت حاصل ہوئی ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میرے نتائج افکار اور آپ کے نتائج افکار میں حیرت انگیز مطابقت پائی جاتی ہے۔ میری رائے میں آپ کی خدمت میں ہدیۂ تحسین پیش کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ میں آپ کے بعض دعاوی کو مبرہن اور مدلّل کر دوں، بعض حقائق کی وضاحت کر دوں، بعض صداقتوں کو مؤکّد کر دوں اور بعض تجاویز کو مشیّد کر دوں۔

۱۔ آپ نے لکھا ہے:

"موجودہ دَور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالادستی کا دَور ہے اور آج پورے کرۂ ارض پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصوّرات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن

© rasailojaraid.

کی ابتدا آج سے دو سَو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی"۔ نیز یہ کہ " مغربی تہذیب و تمدّن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلّط بہت شدید اور ہمہ گیر ہے"۔

آپ کا یہ تبصرہ بالکل صحیح ہے چنانچہ میرے اور علّامہ اقبالؒ دونوں کے معنوی مرشد، لسان العصر اکبر الہ آبادی نے آج سے پچاس سال پہلے انہی حقائق کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں یوں بیان کر دیا تھا:۔

مرزا غریب چُپ ہیں ان کی کتاب ردّی
بُدّھو اکڑ رہے ہیں "صاحب نے یہ کہا ہے"

اور:۔ چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیئر میں چھپے

۲۔ آپ نے لکھا ہے:

" لیکن اس پورے ذہنی اور فکری سفر کے دوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پہ اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں خیالی اور ماورائی تصورات کے بجائے ٹھوس حقائق کو غور و فکر کا اصل مرکز ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادّہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصوّر کے بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوعِ بحث قرار دیا گیا ہے"۔

یہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے، حرف بحرف صحیح ہے۔ آج مغرب شدید نوعیت سے الحاد اور انکارِ خدا کی لعنت میں گرفتار ہے چنانچہ آج مغرب میں منطقی ایجابیت ـــ (LOGICAL POSITIVISM) کا فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے اور اس کے علاوہ جو مدارسِ فکر مقبول ہیں وہ بھی سب کے سب انکارِ خدا و روح و آخرت پہ مبنی ہیں اور خالص مادّیت کے حامی اور مبلّغ ہیں۔ مثلاً:۔

۱) THE PHILOSOPHY OF "AS IF" جس کا سب سے پُرجوش حامی اور وکیل VAIHINGER ہے
۲) PHENOMENALISM " " " " HUSSREL

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

(ج)	DIALECTICAL MATERIALISM	جن کا سب سے پُرجوش حامی اور مبلغ ہے	MARX
(د)	NATURALISM	〃 〃 〃	SANTAYANA
(ہ)	AGNOSTICISM AND SCEPTICISM	〃 〃 〃 〃	J S MILL
(و)	EMERGENT EVOLUTION	〃 〃 〃	LOYD MORGAN
(ز)	ATHEISM	〃 〃 〃	MORRIS COHEN
(ح)	HUMANISM	〃 〃 〃 〃	SCHILLER
(ط)	REALISM	〃 〃 〃 〃	MOORE
(ی)	PRAGMATISM	〃 〃 〃 〃	DEWY
(ک)	LOGICAL EMPIRICISM	〃 〃 〃 〃	CARNAP
(ل)	EXISTENTIALISM	〃	JEAN P SARTRE
(م)	FREUDISM	〃 〃 〃 〃	FREUD
(ن)	BEHAVIOURISM	〃 〃 〃 〃	ADLER
(س)	COMMUNISM	〃 〃 〃 〃	LENIN
(ع)	SOCIALISM	〃 〃 〃 〃	LASKI
(ف)	LOGICAL ATOMISM	〃 〃 〃 〃	RUSSELL
(ص)	PHYSICAL REALISM	〃 〃 〃 〃	SELLARS

ان تمام مدارسِ فکر میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ جو شے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو اس کے وجود پر یقین کرنا سراسر حماقت ہے۔ چونکہ خدا، روح اور حیات بعد الموت تینوں غیر محسوس ہیں۔ اس لیے ان کی ہستی پر یقین خلافِ عقل ہے بلکہ یہ تینوں الفاظ مہمل ہیں کیونکہ ان کے مصادیق خارج میں کہیں موجود نہیں ہیں۔

یورپ میں لامذہبیت اور انکارِ خدا کے اسباب کی داستان بہت طویل ہے۔ جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو انہیں حسبِ ذیل کتابوں کا مطالعہ کیجئے

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

1. CONFLICT BETWEEN RELIGION & SCIENCE By DR. DRAPER.
2. HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE By DR. DRAPER.
3. HISTORY OF THE WARFARE BETWEEN SCIENCE & THEOLOGY By WHITE
4. HISTORY OF EUROPEAN MORALS By DR LECKY.
5. HISTORY OF FREE THOUGHT IN EUROPE By ROBERTSON.

تاہم ناظرین کی خاطر ذیل میں اجمالی طور پر کچھ اشارات درج کیے دیتا ہوں۔

(۱) جب (JUSTINIAN) قیصرِ روم نے یہ دیکھا کہ حکمائے یونان نصرانیت کے خلافِ عقل عقائد پر فلسفیانہ اعتراضات کرتے رہتے ہیں تو اس نے تنگ آ کر ۵۲۹ء میں اپنی قلمرو میں فلسفہ اور حکمت کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا اور تمام فلاسفہ اور حکماء کو جلاوطن کر دیا۔

(۲) اغیار کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد نصرانیوں کی زبان بندی اور ذہنی غلامی کے لیے کلیسائے روم کے اساقفِ اعظم (POPES) نے یہ قانون نافذ کیا کہ جو عیسائی کسی مذہبی عقیدے یا کسی کلیسائی فرمان پہ اعتراض کرے گا، اسے کلیسا سے بھی خارج کر دیا جائے گا اور ملعون قرار دے دیا جائے گا۔ یعنی جیتے جی اچھوت اور بعد وفات اس کا لاشہ بے گور و کفن:

(۳) اجانب اور اقارب دونوں کی طرف سے بے فکر ہو جانے کے بعد کلیسائے روم نے خلافِ عقل عقائد[1] (DOGMAS) کے ساتھ حسبِ ذیل احکام واجب الاذعان بھی

۱؎ مثلاً (۱) تثلیث جس کی رو سے خدا ایک وقت و بیک جہت (باقی اگلے صفحے کے نیچے)

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

نافذ کر دیئے :-

۱۔ معیارِ حق و باطل بائبل نہیں ہے بلکہ کلیسا ہے اور کلیسا سے مراد ہے پوپ اور اس کے ماتحت مذہبی پیشواؤں کی جماعت ۔

۲۔ ہر پوپ ، معصوم عن الخطاء اور مطاع ہے اس لیے اس کے احکام میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے ۔

۳۔ مذہب اور مذہبی عقائد میں عقل کو مطلق دخل نہیں ہے ۔

بجا کہے جسے پاپا ، اسے بجا سمجھو
زبان پوپ کو نقارۂ خدا سمجھو !

۴۔ کلیسائی روایات کا انکار بھی کفر ہے ۔

و بیک حیثیت و بیک اعتبار ایک بھی ہے اور تین بھی ہے نیز وحدت بھی حقیقی ہے اور تثلیث بھی حقیقی ہے ۔

(ب) تجسّم جس کی رو سے کلام (LOGOS) جو خدا کے ساتھ بھی ہے اور خدا بھی ہے ، مجسّم ہو کر یسوع کی شکل میں ظاہر ہوا ۔

(ج) یسوع نے ، اگرچہ وہ خدا تھا اور خدا کی صورت میں تھا ، بوجہ غایت فروتنی (HUMILITY) اپنے آپ کو الوہیت سے معرّیٰ کر دیا اور غلام کی حیثیت اختیار کر لی اور صلیبی موت گوارا کر لی ۔

(د) یسوع مسیح نے مصلوب ہو کر قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے پیدائشی گناہوں کا کفّارہ ادا کر دیا ۔

(ہ) جب پادری ، عشاءِ ربانی کے وقت روٹی اور شراب پر یسوع کا نام لے کر دعا کرتا ہے اور اسے اپنے ہاتھ سے متبرک کر دیتا ہے تو وہ روٹی یسوع کا جسم اور شراب یسوع کا خون بن جاتی ہے ۔ اس ناقابلِ فہم عمل کو اصطلاح میں (TRANSUBSTANTIATION) کہتے ہیں ۔ اردو میں اس کا ترجمہ ہوگا استحالۂ جوہری یا انقلابِ ذات ۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

۵ - پوپ اور کلیسا کو گناہ معاف کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

۶ - کلیسا کے علاوہ کسی شخص کو بائبل لکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

(د) تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اندلس کے مشہور فلسفی ابن رشد (متوفی ۱۱۹۸ء) کی تمام تصانیف کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوگیا اور پندرہویں صدی میں اس کی تمام تصانیف اٹلی اور فرانس کی یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہوگئیں۔ ان تصانیف کی بدولت یورپ ایک ہزار سال کے بعد ارسطو کے فلسفے سے واقف ہوا اور اس کی وجہ سے یورپ میں سولہویں صدی میں دو تحریکیں رونما ہوئیں جن کا نام "احیاء العلوم" اور "اصلاح کلیسا" ہے۔ چنانچہ رومن کیتھولک کلیسا، جس کے خلاف لوتھر نے صدائے احتجاج بلند کی اس بات کا معترف ہے کہ لوتھر بڑی حد تک ابن رشد کے فلسفے سے متاثر ہوا تھا۔ میری تحقیق بھی یہی ہے کہ لوتھر کے دماغ میں کلیسا کی اصلاح کا خیال ابن رشد کی تصانیف کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا۔

قصہ مختصر سولہویں صدی میں حسب ذیل پادریوں نے جو رومی کلیسا سے وابستہ تھے، کلیسا کی چیرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی (ERASMUS) م ۱۵۳۶ء (ZIVINCLI) م ۱۵۳۱ء (LUTHER) م ۱۵۴۶ء (MCLANCTHON) م ۱۵۶۱ء اور CALVIN م ۱۵۶۴ء۔ ان کا سربراہ لوتھر تھا اس نے یہ اعلان کیا کہ بائبل کی صداقت کا دارومدار کلیسا پر نہیں ہے (جیسا کہ کلیسا کہتی تھی) بلکہ خود کلیسا کی صداقت کا دارومدار بائبل پر ہے یعنی معیار حق و صداقت بائبل ہے نہ کہ پوپ یا کلیسا۔

لوتھر اور اس کے ہمنواؤں کے احتجاج (PROTEST) کا نتیجہ یہ نکلا کہ رومن کیتھولک مذہب کے مقابلے میں یورپ میں پراٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوگیا اور کلیسا کا اقتدار بڑی حد تک ختم ہوگیا۔

تحریک احیاء العلوم کی بدولت یورپ میں فلسفے (خصوصاً فلسفہ ارسطو) کے مطالعے کا ذوق از سر نو زندہ ہوگیا اور جب اس کی بدولت یورپ کو عقلی آزادی نصیب ہوئی تو سترہویں صدی میں سائنس کا دور شروع ہوا جو آجکل بیسویں صدی میں اپنے

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

نقطۂ عروج کو پہنچا ہوا ہے۔

(۸) اہلِ سائنس اور اہلِ فلسفہ دونوں نے کلیسائیت اور نصرانیت کے خلاف عقل عقائد پر اعتراضات وارد کئے۔ کلیسا اور نصرانیت دونوں ان کے جوابات سے قاصر اور عاجز تھیں۔ اس لیے انہوں نے معترضین کو کلیسا اور مذہب دونوں سے خارج کر دیا۔

کلیسا سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ اس نے سائنس کی تحقیقات کو بھی مذہب کے خلاف قرار دے دیا مثلاً جب کاپرنیکس اور گلیلیو نے یہ کہا کہ زمین گول ہے اور آفتاب کے گرد گھوم رہی ہے تو کلیسا نے کہا یہ باتیں مذہب کے خلاف ہیں اور ان کے قائلین کافر ہیں

(۹) کلیسا کی عقل دشمنی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سائنس اور مذہب میں جنگ شروع ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ حکما اور فلاسفہ نے مذہب کو خیرباد کہہ دیا اور اس طرح یورپ میں لامذہبیت پھیل گئی۔

© rasailojaraid.c

اٹھارہویں صدی کے نصفِ اوّل میں (HUME) نے لاادریت کا فلسفہ پیش کیا اور عقلی دلائل سے ثابت کیا کہ عقلِ انسانی، خدا کی ہستی کا اثبات نہیں کر سکتی۔ ہیوم کے اس فلسفے کو کانٹ (KANT) نے ۱۷۸۱ء میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا اور اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تنقیدِ عقلِ خالص" میں خدا کی ہستی پر جو دلائل فلاسفہ نے مدون کئے تھے، ان سب کا ابطال کر دیا، اور اس طرح انکارِ خدا کی راہ ہموار کر دی۔

انیسویں صدی میں مشہور منطقی سر ولیم ہیملٹن اور مشہور عالم الٰہیات ڈاکٹر مینسل نے ہیوم اور کانٹ کے نظریات کی یہ کہہ کر مزید تائید کر دی کہ ذہنِ انسانی خدا کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا۔ ان کے بعد مل اور اسپنسر نے اپنے فلسفۂ "لاادریت" سے مذکورہ بالا حکماء کے نظریات کو تقویت پہنچائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انکارِ خدا کا عقیدہ خواص اور عوام دونوں کے دماغوں میں جاگزیں ہو گیا۔

جب یورپ کو کلیسا اور پوپ کی غلامی سے نجات ملی تو حکما اور فلاسفہ نے نفسِ مذہب کے ساتھ ساتھ نصرانیت اور کلیسائی عقائد کو بھی ہدفِ تنقید بنایا اور انیسویں صدی میں ان کی تنقید اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ چنانچہ اس صدی کے نصفِ اوّل میں مشہور

© rasailojaraid.c

جرمن فاضل اور محقق اسٹراس (STRAUSS 1808-1874) نے ۱۸۳۵ء میں حیات یسوع (LEBANJESU) لکھ کر کلیسا کے ایوان میں زلزلہ ڈال دیا۔ اس غیر فانی کتاب میں اس نے اس بات کو مبرہن کیا کہ یسوع کی شخصیت تاریخی طور پہ ثابت نہیں ہو سکتی نیز یہ کہ یسوع تو قدیم دیوتا متھرا کا مثنیٰ ہے اور جو مذہب اس کے نام سے منسوب ہے وہ متھرائیت کا چربہ ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر ڈ واکر پروفیسر تاریخ کلیسا نے اپنی تصنیف تاریخ کلیسا میں اس کتاب کو THE MOST EPOCH-MAKING BOOK عظیم ترین عہد آفریں کتاب قرار دیا ہے۔

۱۸۴۲ء میں ہیگل کے مشہور شاگرد فیورباخ (م ۱۸۷۲ء) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "THE ESSENCE OF CHRISTIANITY" شائع کی جس میں اس نے عیسائی مذہب اور اس کے تصورِ ذات باری دونوں کا ابطال کر دیا۔

۱۸۶۳ء میں فرنچ فاضل ارنسٹ رینان (م ۱۸۹۲ء) نے حیات یسوع (VIE DE JESUS) لکھی جس میں اس نے یہ ثابت کیا کہ یسوع محض ایک انسان تھا۔

پروفیسر بور (F C BAUR) نے بائبل کی کتابوں پر تنقید کی اور ثابت کیا کہ پولوس کے خطوط میں سے صرف تین اصلی ہیں باقی سب جعلی ہیں اس لیے بائبل بحیثیت مجموعی قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

(س) میں نے بخوف طوالت چند نقادوں کے تذکرے پہ اکتفا کیا ہے۔ میرا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اس تنقید کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پہلے مذہب عیسوی اور اس کے بعد نفس مذہب بھی پایۂ اعتبار سے ساقط ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کو اس بات سے بھی بہت ضعف پہنچا کہ یورپ میں جو فلسفہ — اور اس سے میری مراد فلسفہ تصوریت (IDEALISM) ہے، مذہب کا حامی تھا، انیسویں صدی میں اس پر چاروں طرف سے اعتراضات شروع ہو گئے اور اس کے زوال کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلسفے کے میدان میں

© rasailojaraid.com

مذہب کا کوئی مددگار باقی نہ رہا اس کی تفصیل یہ ہے :۔

انیسویں صدی میں کارل مارکس نے اپنے فلسفہ اشتراکیت کو مسلکِ مادّیت کی اساس پر قائم کیا جو خدا اور روح دونوں کا منکر ہے۔

ڈاروِن نے نظریۂ ارتقا پیش کیا جس سے مسلک مادّیت کو تقویت حاصل ہوئی،

شوپن ہاور نے نظریۂ قنوطیت (PESSIMISM) کی اشاعت کی اور یہ نظریہ بھی خدا اور مذہب کا مخالف ہے۔

مِل اور اسپنسر نے مسلکِ لاادریت کی تبلیغ کی اور یہ مسلک بھی مذہب اور خدا کے بارے میں شکوک پیدا کرتا ہے۔

نطشہ (NEITZCHE) نے بھی اپنے فلسفے میں خدا کا انکار کیا اور ANTI — CHRIST لکھ کر عیسائیت پر کاری ضرب لگائی۔

بیسویں صدی میں وجودیت (EXISTENTIALISM) اور منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) نے مادّیت کو تقویت پہنچائی اور جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں آج یورپ میں آخرالذکر فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ جس کی رو سے خدا، روح اور آخرت تینوں الفاظ قطعاً مہمل اور بے معنی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ بریڈلے (م ۱۹۲۴ء) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب مظاہر اور حقیقت "APPEARANCE & REALITY" میں مادّیت کی پورے طور سے تردید کردی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر رشید ڈل نے اپنی تصنیف "فلسفہ اور مذہب" میں میرے قول کی بایں الفاظ تائید کی ہے۔ "مسٹر بریڈلے نے اپنی تصنیف کے ابتدائی ابواب میں مادّیت کے مقابلے میں تصوریت کی جس انداز سے حمایت کی ہے اس کی تردید نہیں ہوسکتی۔" (ص ۲۷)

لیکن یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ عصرِ حاضر میں الحاد پرور سائنس اور ملحدانہ مدارسِ فلسفہ کو جو قبول عام کی سند حاصل ہوگئی ہے اس کی وجہ سے فلسفۂ تصوریت جو مادّے کے مقابلے میں روح کو اصلِ کائنات اور حقیقتِ اقصیٰ قرار دیتا ہے، غیر مقبول ہوچکا ہے۔ آج کی دنیا میں حکماء اور فلاسفہ کی اکثریت کا میلان مادّیت کی طرف ہے اور مذہب کی

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

اپیل بہت کمزور ہوگئی ہے اور سائنٹفک نظریات نے بہت سے مذاہب کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔

عصرِ حاضر میں پانچ مدارسِ فکر بہت مقبول ہیں۔ اور سب کے سب الحاد پرور ہیں۔ اور انکارِ خدا و روح پر مبنی ہیں یعنی:۔

1 PLURALISTIC REALISM

2. DIALECTICAL MATERIALISM

3 EXISTENTIALISM

4. NATURALISM

5. LOGICAL POSITIVISM

اور ان میں آخر الذکر فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔

خلاصۂ کلام یا رجحانِ عصرِ حاضر

قصہ مختصر خدا اور مذہب کے بارے میں جو شکوک اور شبہات جدید تعلیم یافتہ طبقے کے افراد میں پائے جاتے ہیں، ان کے اسباب یہ ہیں:۔

(ا) سائنٹیفک اسپرٹ (روح) کی روزافزوں نشوونما اور آبیاری۔

(ب) ٹیکنولاجیکل تہذیب کی ترقی۔

(ج) مادّی علوم وفنون کا عروج۔

(د) ایجادات کی بدولت تسخیرِ عناصرِ کائنات کا سلسلہ۔

(ہ) لذّاتِ جسمانی اور ترغیباتِ جنسی کی روزافزوں فراوانی اور بوقلمی۔

ان عناصر سے انسان کا نقطۂ نظر سراسر مادّی ہوگیا ہے اور اس کا اثر حیات کے ہر شعبے پر مرتب ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنسی فتوحات نے انسان کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے[1]

---

[1] نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی ۔ یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے (اقبالؔ)

© rasailojaraid.

خدا سے بے نیازی کی ابتداء تو کاپرنیکس ہی کے عہد سے شروع ہو چکی تھی اسی لیے لاپلاس (LAPLACE) (م ۱۸۲۷ء) نے نپولین کے سوال کے جواب میں یہ عہد آفریں جواب دیا تھا کہ "میں نے اپنی تصنیف 'توضیحِ نظامِ کائنات' میں خدا کا ذکر محض اس لئے نہیں کیا کہ عقل کی مدد سے کائنات کا نظام خدا کے بغیر بھی بخوبی مدون ہو سکتا ہے۔" اور اسی لیے بیسویں صدی میں اقبال کے استاد میک ٹیگرٹ[۲] (م ۱۹۲۵ء) نے جب اپنا فلسفۂ خودی — ONTOLOGICAL IDEALISM کے عسیر الفہم عنوان سے مرتب کیا تو انسانی خودی کو حقیقت (REALITY) تسلیم کرنے کے بعد خدا کو اپنے نظامِ فکر سے بکلّی خارج کر دیا۔

فزیکل سائنس ہر لمحے ہماری حیاتِ اجتماعی و انفرادی کو متاثر کر رہا ہے۔ خصوصاً ہمارے مدارس فلسفہ ہمارے مذاہب اور حیات و ممات سے متعلق ہمارے عمومی زاویۂ نگاہ پر تو نمایاں اور ناقابلِ تردید اثر مرتب ہوا ہے۔

جدید سائنس کی رو سے حیاتِ عضوی کی توجیہہ محسوس فطری توانین کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ اس کے لئے کسی فوق الفطرت طاقت کا سہارا نہیں لیا جاتا اور اس سائنٹیفک توجیہہ کی رو سے انسان فاعل مختار (FREE MORAL AGENT) نہیں ہے۔

اسی طرح جدید نفسیات کی رو سے انسان اپنی ذات کا مالک نہیں ہے۔ نفسِ انسانی کی باشعور زندگی پر اس کی حیوانی جبلتوں کی حکومت ہے جو اس کے لاشعور میں پوشیدہ ہیں۔ فرائڈ یہ بھی کہتا ہے کہ ارادہ و مشیّت کی آزادی دراصل ایک خود پسندانہ فریبِ نفس ہے۔ انسانی شخصیّت کا تعین خارجی ماحول سے ہوتا ہے۔ جیسا ماحول مل گیا ویسا ہی انسان بن گیا۔

فلسفۂ اخلاق بھی سراسر مادّی بنیادوں پر استوار کر دیا گیا ہے۔ پروفیسر ڈیوی

---

[۲] اقبال نے ۱۹۳۵ء میں اپنے استاد کے سوانح حیات پڑھ کر اس کی یاد میں ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا اور اس کے آغاز میں اسے PHILOSOPHER SAINT "فلسفی ولی" کے لقب سے نوازا تھا۔

© rasailojaraid.

لکھتا ہے کہ "اخلاقی اقدار بھی اُسی طرح غیر مستقل اور بے ثبات ہیں جس طرح بادل۔ مستقل (ازلی) اقدار کا تصوّر محض خوش فہمی ہے"۔ رہے مسائلِ مابعد الطبیعات تو ان کے متعلق منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) کا فتویٰ یہ ہے کہ جو شے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو وہ ناقابلِ التفات ہے۔ کائنات اور حیاتِ انسانی کے بارے میں سائنس اور فلسفۂ مادّیت کا قولِ فیصل یہ ہے کہ یہ دونوں بے مقصد ہیں۔ انسان کی تقدیر یہ ہے کہ وہ پیدا ہو، کھائے پیئے، افزائشِ نسل کرے اور آخر کار مر کر ہمیشہ کے لیے فنا (معدوم) ہو جائے۔ الغرض جدید سائنس اور فلسفے کی روح، مذہب کے خلاف ہے۔

یہ ہے مختصر طور پر آپ کے مضمون کے ابتدائی حصے کی توضیح۔ میں نے نہایت اختصار کو مدّنظر رکھا ہے ورنہ یہ موضوع اس قدر وسیع الذّیل ہے کہ اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "اس قسم کی کوشش کا مظہرِ اتمّ برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعتہً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی"۔ نیز یہ کہ "یہ امر واقعی ہے کہ اُن (سر سیّد) کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل گئی اور مادّہ پرستانہ ذہنیت کے تحت مذہب کا ایک لامذہبی ایڈیشن تیار ہوا"۔ میں آپ کے اخذ کردہ ان نتائج سے بالکل متفق ہوں۔ سر سیّد نے مذہب کے درخت میں مغربی فلسفے کا جو پیوند لگایا ہے اس کے اثمارِ تلخ سے پاکستانی مسلمانوں کے کام و دہن بقدر ذوق خوب لذت اندوز ہو رہے ہیں۔ 'دقیانوسی' ٹائپ کے مسلمان ابھی سے اس تلخی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔ انہیں کون بتلائے کہ ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی مغربی مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادّے کو اور حیاتِ اخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اقرار تو موجود ہے لیکن ایمان باللہ کی وہ کیفیت کہ انفس اور آفاق

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

میں تنہا وہی فاعل مطلق، مؤثر حقیقی اور مسبّب الاسباب نظر آنے لگے، بالکل مفقود ہے ۔۔
رسالت کا اقرار تو موجود ہے لیکن محبت رسولؐ نام کو موجود نہیں ہے "

میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور آپ کو اس حقائق رسی، ژرف نگاہی اور معرفت نگاری پر داد دیتا ہوں۔ سچی بات یہی ہے کہ جب تک ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کو فاعل حقیقی اور مؤثر حقیقی نہ سمجھے وہ قرآنی توحید کے مقام پہ فائز نہیں ہو سکتا۔ اسلامی تصوف جسے جاہل صوفیوں نے بدنام کر دیا، دراصل توحید ہی کو دل و دماغ میں جاگزیں کرنے اور اسے زندگی میں ایک عامل مؤثر بنانے اور اس کے تقاضوں پہ عمل کے لیے آمادہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانی[1] رح اپنی تصنیف فتوح الغیب کے تیسرے مقالے میں فرماتے ہیں کہ "اے بیٹے اس بات کو حرزِ جاں بنالے کہ لا فاعل فی الحقیقت ولا مؤثر فی الحقیقت الا اللہ" واحسرتا! آج شیخ موصوف رح کے نام پر گیارہویں کی نیاز کرنے والے تو لاکھوں ہیں مگر ان کی تعلیم پر عمل کرنے والا ایک بھی نظر نہیں آتا۔ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس بزرگ نے پچاس برس تک مسلمانوں کو یہ تلقین کی ہو کہ اللہ کے سوا کوئی دستگیر نہیں، کوئی مشکل کشا نہیں، کوئی حاجت روا نہیں، آج اس کے نام لیوا خود اسی کو دستگیر اور مشکل کشا سمجھتے ہیں اور اللہ کے بجائے اسی کو پکارتے ہیں ۔۔۔

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "ضرورت اس امر کی ہے کہ اُمّت میں تجدیدِ ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو تاکہ ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کرے"
میں اس باب میں آپ سے بکلّی متفق ہوں۔ اقبال نے اسی بات کو یوں ظاہر کیا ہے

---

[1] شیخ موصوف ۴۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بیس سال کی عمر میں دینی علوم سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد بیس سال تک اپنے مرشد کے زیرِ تربیت رہ کر تزکیۂ نفس کرتے رہے، چالیس سال کی عمر میں مرشد کے حکم سے تلقین و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور پچاس سال تک مسلمانوں کو توحید کا درس دیتے رہے اور طالبانِ حق کی رہنمائی کرتے رہے۔ ۵۶۱ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ ع
رحمتِ ایزدی بر روحش باد!

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.c

بالفاظِ دگر انہوں نے بھی یہی علاج تجویز کیا ہے :-

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

صحابۂ کرام رضؓ کی زندگیوں میں ہمیں یہی انقلاب نظر آتا ہے کہ عقیدۂ توحید ان کا حال بن گیا تھا اسی انقلاب کا یہ نتیجہ تھا کہ "انہیں یہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی اور خیالی نظر آتی تھی لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہوتی تھی۔" وہ جس طرف کو منہ کرتے تھے انہیں اللہ ہی نظر آتا تھا اور وہ ہر واقعے میں اللہ ہی کو کارفرما دیکھتے تھے۔ اکبر الٰہ آبادی نے ذیل کے شعر میں یہی انداز نگاہ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے ۔

ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ
مطلب یہ ہے کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "ایمان بالغیب کے لیے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی یہ تبدیلی لازمی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے ۔ لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہو ... حیاتِ دنیوی فانی ہی نہیں بالکل غیر حقیقی اور بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اخروی حقیقی اور واقعی نظر آنے لگے جب تک اُمت کے ایک قابلِ ذکر حصّے میں نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی رونما نہ ہو' احیائے اسلام کی آرزو ہرگز ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی۔" میں آپ کی اس بات سے بکلّی اتفاق کرتا ہوں بلکہ میری دلی آرزو یہ ہے کہ اللہ آپ کو توفیق دے کہ آپ اس صداقتِ عظمٰی کو پاکستان ہی نہیں تمام دنیائے اسلام میں شائع کر سکیں اور ہر مسلمان تک پہنچا سکیں ۔ میں پچاس برس کے غور و فکر کے بعد جس نتیجے پر پہنچا' اللہ نے آپ کو دس پندرہ سال کے غور و فکر کے بعد اسی نتیجے پہ پہنچا دیا اور مزید کرم یہ کیا کہ اسے پبلش کرنے کی سعادت بھی آپ کو عطا فرمائی ۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے جو تحریکیں ہندوستان اور دوسرے اسلامی ملکوں میں برپا ہوئیں وہ سب میری نگاہوں کے سامنے ہیں اور میں نے اپنی آنکھوں سے ان تحریکوں کو ناکام ہوتے دیکھا ہے ۔ سبب اس ناکامی کا وہی ہے جو آپ نے بیان کیا

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

ہے کہ جن لوگوں نے یہ تحریکیں برپا کیں ان میں بنیادی نقص یہ تھا کہ اللہ کے ساتھ ان کا تعلق محض قال تک محدود تھا بالفاظِ دگر وہ اسلام کا نام تو لیتے تھے، مگر اس کی روح سے بیگانہ تھے۔ اسلام کی روح، جیسا کہ میں سمجھا ہوں محض ارکانِ اسلام کی رسمی پابندی نہیں ہے بلکہ دل کی آنکھوں سے اللہ عزوجل کا مشاہدہ یا اُس ذاتِ پاک کے ساتھ ایسا شدید قلبی رابطہ ہے جو مسلمان کو اس مقام پر پہنچا دے جہاں پہنچ کر ہر وقت اللہ ہی پیشِ نظر رہتا ہے۔ غیر اللہ کی ہستی کالعدم ہو جاتی ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے "عوام کے قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ترین ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب اور اذہان معرفتِ ربّانی سے منوّر ہوں اور سینے، کبر و حسد، بغض و عناد سے پاک ہوں اور زندگیاں حرص و طمع اور حبِّ دنیا سے خالی ہوں۔"

میں اس معاملے میں بھی آپ سے بکلّی متفق ہوں، از راہِ تفاخر نہیں بلکہ بطور اظہارِ حقیقت یہ بات لکھ رہا ہوں کہ میں نے پچاس سال سے زائد عرصہ منطق، فلسفہ، الٰہیات اور علم کلام کے مطالعے میں صَرف کیا لیکن خدا گواہ ہے کہ نہ تو ان علوم و فنون سے اللہ کے ساتھ تعلق پیدا ہوا اور نہ کتابوں سے کبر و حسد، بغض و ریا اور حرص و طمع کا ازالہ ہوا۔ ان امراضِ خبیثہ کا ازالہ تو کیا ہوتا الٹا میرا دماغ شکوک و شبہات کی جولانگاہ بن گیا اور اگر اس عالمِ پیری میں (سنِ ولادت ۱۳۱۳ھ) توفیقِ ایزدی تصوّف کے نخلستان میں نہ پہنچا دیتی تو آج تشکیک کے ریگستان میں العطش العطش پکارتا ہوتا۔ شکر ہے کہ وفات سے پہلے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی کہ

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا (اکبرؔ)

سچ کہا ہے شیخ سعدیؒ نے:۔

بجز یادِ دوست ہر چہ کنی عمر ضائع ہست — بجز سرِّ عشق ہر چہ بخوانی بطالت است
سعدی بشوئے نقشِ دوئی را ز لوحِ دل — علمے کہ راہِ حق نہ نماید، جہالت است

نیز سچ کہا ہے مرشدِ رومیؒ نے:۔

© rasailojaraid.com

علم چہ بود ؟ آنکہ رہ بنمایدت — زنگِ گمراہی ز دل بزدایدت
علم بنود غیرِ علمِ عاشقی — مابقی، تلبیسِ ابلیسِ شقی

یہ صحبت ہی کا تو ثمرہ تھا کہ ابو ابی قحافہؓ، صدّیق اکبرؓ کے مقام پہ فائز ہو گئے اور یہ صحبت ہی کا تو کرشمہ تھا کہ ابنِ خطّاب کو فاروق اعظمؓ کا مرتبہ حاصل ہو گیا ۔ رضی اللہ عنہما

اسی لیے اقبالؔ نے یہ کہا :-

صحبت از علمِ کتابی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حر، آدم گر است
دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک اٹھے جو تعلیم یافتہ طبقات اور ذہین افراد میں انقلاب برپا کر دے یعنی انہیں خدا پرستی اور خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے ...... الخ "

مَیں آپ کی ان تجاویز سے بکلّی متفق ہوں اور اس دُعا پر اس خط کو ختم کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو عصرِ حاضر میں دعوت و تبلیغِ اسلام کی توفیق ارزانی فرمائے اور یہ حقیقت آپ پر واضح کر دے کہ مقصدِ حیات استرضاءِ باری تعالیٰ ہے نہ کہ حصولِ حکومت ارضی۔ حکومت یا خلافت ایمان و عملِ صالح کا ثمرہ ہے نہ کہ مقصود بالذات شئے ۔ اور آپ سے استدعا ہے کہ آپ اس ننگِ خلائق کے خاتمہ بالخیر کی دُعا فرمائیں ۔

وقتِ طلوع دیکھا، وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہے، دنیا کو خوب دیکھا — (اکبرؔ)

والسّلام خیر الختام
مجمع عیوب و زشتی یوسف سلیم چشتی

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c